ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

شاعری اور شاعر

علمی تحریر و تقریر کے لیے غالباً سب سے پہلے سقراط نے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ موضوعِ زیرِ بحث کی تعریف و تحدید کی جائے، پیشتر اس کے کہ اس کی صحت و سقم یا حسن و قبح یا روا و ناروا ہونے پر استدلال شروع ہو۔ اس طریقے سے ہیولائی بحثوں میں بھی حقیقت کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ سقراط کے بعد ارسطو نے تعریف و تحدید کے قواعد مقرر کیے جو دو ہزار برس سے منطقیوں کی زبان پر ہیں لیکن اس عالمِ تنوع و کثرت میں کتنے مظاہر اور اشیا ہیں جن کی تعریف ہو سکتی ہے؟ کتنے حدود ہیں جن میں جنس پر فصل کے اضافے سے ایک معین تصور ذہن میں آسکتا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ احساس سے لے کر گہرے سے گہرے وجدان تک محسوساتِ حیات کا تمام خزانہ مفتاحِ منطق سے نہیں کھلتا۔ مٹھاس کیا ہے؟ درد کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ عشق کیا ہے؟ کوئی ہے جو ان تصورات کی منطقی تعریف کر سکے؟ یہ کہنا کہ مٹھاس وہ احساس ہے جو میٹھی چیز کھانے سے پیدا ہوتا ہے، درد وہ ہے جو لذّت نہیں، یا زندگی وہ شے ہے جو زندہ ہستیاں محسوس کرتی ہیں، یا عشق وہ کیفیت ہے جو عاشق کے دل میں موجود ہو جاتی ہے، حقیقت میں نطق و منطق کے لیے اظہارِ عجز اور سپر انداختن ہیں۔ یہی کیفیت شاعری کی ہے۔ ارسطو سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے نقادوں تک مختلف کوششیں اس فن کے تعینِ خصوصیات کے لیے کی گئیں، لیکن اس کی اصلیت زندگی کے دیگر اساسی وجدانات کی طرح محسوس کرنے والے کے لیے سب سے زیادہ بدیہی ہونے کے باوجود حیطۂ منطق کے لیے حلقۂ بیرونِ در ہے۔ بعض لوگ شاید خیال کریں کہ اس میں بڑی دقت کیا ہے؟ ہر پڑھا لکھا آدمی خواہ وہ خود شاعر نہ ہو، شعر سے واقف ہے کہ وہ کسی قسم کے کلام کا نام ہے۔ کلام میں وزن اور قافیہ ہو تو شعر بن جاتا ہے اور وزن و قافیہ کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو نثر ہے۔ لیکن کون شخص ہے جو ذرا سے غور کے بعد اس تعریف کے نقص سے واقف نہیں ہو جاتا۔ بعض زبانوں میں عظیم الشان نظمیں قافیہ سے معرا ہیں اور بعض نثریں ایسی ہیں جن کو شاعرانہ نثریں کہتے ہیں۔ بعض لوگ

جنھوں نے کبھی ایک مصرع بھی موزوں نہیں کیا شاعر مزاج ہوتے ہیں اور بعض شاعر یا متشاعر ایسے بھی گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جنھوں نے عمر کا بیشتر حصہ سخن سنجی یعنی الفاظ کو وزن و قافیہ کی میزان میں تولنے میں بسر کیا ہے، لیکن اہلِ ذوق کے نزدیک وہ شاعری سے محروم ہیں۔ اس پر بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر قسم کا کلام محض صوتی موزونیت سے شعر نہیں بن جاتا۔ جس خیال یا جذبے کا اظہار اس کلامِ موزوں میں کیا گیا ہے اس میں حقیقت بھی ہونی چاہیے۔ تو اس اضافے سے یوں کہیں گے کہ شاعری اس خیال یا جذبے کا موزوں کلام میں اظہار ہے جو حقیقت پر مبنی ہو۔ اگر حقیقت سے مراد مظاہرِ وجود یا مظاہرِ نفس کا لفظی بیان ہو تو صاحبِ منطق اور فلسفہ اس کام کو نثر میں بطریقِ احسن انجام دیتا ہے۔ بعضوں کے نزدیک شاعری تلاشِ حسن اور آفرینشِ حسن ہے۔ گو ایک قسم کی شاعری کے لیے یہ صحیح ہے لیکن شعر کے تمام اصناف کے لیے یہ تعریف جامع نہیں۔ غالب نے اسی خیال سے دیدہ وری کی جو تعریف کی ہے:

دیدہ ور آں کہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

وہ اکثر شاعروں کی فطرت اور بصیرت کا جزوِ اعظم ہونے کے باوجود شعر اور تخلیقِ شعر کی پوری ماہیت پر حاوی نہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شاعر زندگی کے صرف تاریک پہلوؤں کو دیکھتا اور اپنے کلام میں صرف اپنے نالوں کو موزوں کرتا رہتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ موزوں نالے حسن و عشق کا داموختت ہونے کے باوجود شاعری نہیں۔ بعضوں کے نزدیک جذبہ شعر کی ایک تمیز خصوصیت ہے۔ ان کے نزدیک شعر ایک جذبہ اور موزوں کلام ہے۔ یہ تعریف مذکورۂ صدر تعریفوں کے مقابلے میں زیادہ جامع ہونے کے باوجود مبہم ہے۔ جذبات کے انداز بے شمار ہیں۔ سب کے سب کلامِ موزوں میں داخل ہو کر اسی کو شعر نہیں بنا سکتے۔ خود غرضی، غصہ، ظلم وغیرہ بھی جذبات ہیں۔ اگر کوئی شخص رذیلانہ اور بہیمانہ غصہ میں کسی کو پُر جوش الفاظ اور کلامِ موزوں میں صلواتیں سنائے تو کیا اس کا یہ کلام شاعری کے معیار کے مطابق ہوگا؟ اگر نہیں تو ہم کو اس امر کا اور زیادہ تعین کرنا پڑے گا کہ انسان کی جذباتی اور وجدانی زندگی کے وہ کیا انداز ہیں جن کے طلاپ سے موزوں اظہارِ حقیقت شاعری ہو جاتا ہے۔ اقبال نے محض اظہارِ حقیقت اور شعر میں جو فرق ہے اس کو نہایت

خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است ۔۔۔ شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم ! ۔۔۔ دستِ رومی پردۂ محمل گرفت !

تمام فنونِ لطیفہ انسان کے لطیف اور ناقابلِ تعیین جذبات کے اظہار کے مختلف ذرائع ہیں یہ مانا کہ شاعر کے لیے سوز اور درد کی ضرورت ہے اور بقول غالب دلِ گداختہ ہی شمعِ سخن کا حسن و فروغ ہے لیکن سوز کیا چیز ہے؟ اگر سوز غم زدگی ہے تو کیا زندگی کو سراپا بہار محسوس کر کے منظرِ مسرت میں بھی گل ہائے انبساط کھلانے والی طبیعت لازماً شعر سے معرا ہوتی ہے۔ غالب نے اپنی ایک نہایت پرجوش اور بلند فارسی غزل کے مطلع میں اپنی اس کیفیت کو بیان کیا ہے جو شعر لکھتے ہوئے اس پر طاری ہوتی ہے۔

جیحون ام از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل

غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

مگر یہ گدازِ دل اور سوز و درد بھی انسانی طبیعت کا ایک گوہرِ بے بہا ہونے کے باوجود شعر اور شاعری کی پوری ماہیت بیان نہیں کرتا۔ اگر یہ کہیں کہ وہ جذبات اور وہ سوز و گداز جو انسان اور انسان میں ہمدردی اور انسان اور خدا میں لطیف تعلقات اور گہری کیفیات کا اظہار کریں، جنھیں عشق کہتے ہیں، یا اس عمل میں سرزد ہوں، جسے نیکی کہتے ہیں، تو شاعری مذہبی تلقین و تعلیم ہو جاتی ہے، جو وہ حقیقت میں نہیں ہے۔ اکثر نقادانِ فن نے ناصحانہ شاعری کو شاعری سے خارج کر دیا ہے۔ سعدی کی پند و نصائح کی شاعری، مثلاً،

آدمی را عقل باید در بدن

ورنہ جاں دارد کالبد دارد حمار

با بداں مباش و با نیکاں نکو،

جائے گل، گل باش، و جائے خار خار

حقیقت میں نیا تلا وعظ ہے، شاعری نہیں۔